tsurdu.blogspot.com

نگاہِ معتبر

تحریر: ارشد علی شہاب

مولوی مشتاق علی اپنے حجرے میں لیٹے تھے۔ عشاء کی نماز کے بعد انہوں نے کچھ دیر مسجد میں آنے والے نمازیوں سے کچھ باتیں کیں پھر سارے لوگ ایک ایک کر کے مسجد سے چلے گئے اور ساری مسجد خالی ہوگئی۔ مؤذن صاحب بھی کچھ دیر مولوی صاحب کے ساتھ ان کے حجرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے اور پھر انہوں نے بھی اجازت چاہی۔

مولوی صاحب نے اٹھ کر حجرے کا دروازہ بند کیا اور سونے کے لیے اپنے بستر پر آ گئے۔ وہ جلد از جلد سونا چاہ رہے تھے۔ عشاء کی نماز کے بعد وہ بنا کسی اشد ضرورت کے نہیں جاگتے تھے۔ اس لیے دیر سے سونے میں انہیں ڈر ہوتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ رات کے آخری پہر ان کی آنکھ نہ کھلے اور وہ تہجد نہ پڑھ سکیں۔

لیٹے تو وہ سونے کے ارادے سے ہی تھے مگر کچھ باتیں ایسی تھیں جو انہیں پریشان کر رہی تھیں اور وہ سو نہیں پا رہے تھے۔

ان کی آنکھوں میں رہ رہ کر اس لڑکی کا چہرہ آ رہا تھا جو آج شام کو بختاور حسین لے کر آیا تھا۔ ظہر کی نماز کے بعد بختیار حسین ان کے پاس آیا اور اس نے نہایت پریشانی کے عالم میں کہا۔

’’مولوی صاحب! میں بے حد پریشان ہوں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس پریشانی کے عالم میں کس کے پاس جاؤں پھر دل نے کہا کہ آپ کے پاس جاتا ہوں اور جا کر اپنی پریشانی بیان کروں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ ہی میری اس پریشانی کا کوئی حل بتائیں۔‘‘

’’ہاں ہاں آپ بلا جھجک اپنا ہر مسئلہ میرے سامنے پورے اعتماد کے ساتھ بیان کر سکتے ہیں۔ اگر خدا نے چاہا اور اسے منظور ہوا اور میرے بھی بس میں ہوا تو میں اپنی ہر ممکن کوشش کروں گا کہ آپ کی مشکل اور پریشانی دور ہو جائے۔‘‘ مولوی مشتاق علی نے انتہائی خلوص سے کہا۔

’’بات یہ ہے مولوی صاحب! کہ میری ایک بیٹی ہے۔ زرینہ نام ہے اس کا۔ جوان بچی ہے۔ میں تو نجانے کب سے اس بات کا منتظر ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیکوکاروں میں سے کسی کو بھیج دے تو میں اس کا نکاح پڑھا دوں۔ مگر نجانے میرے رب کو میری کتنی اور آزمائش منظور ہے۔ ہر روز آنے والوں کی راہ تکتے تکتے میری تو آنکھیں پتھرا گئیں ہیں۔ بیوی بھی ساتھ چھوڑ کر خدا کے پاس چلی گئی۔ اب گھر میں میں اور میری بچی زرینہ گھر میں ہی رہتے ہیں۔ بچی کی عمر ماشاءاللہ پچیس برس کی ہوگئی ہے۔ آپ تو یہ بات جانتے ہی ہیں کہ ہمارے گاؤں میں اتنی عمر کی لڑکیاں بوڑھی شمار کی جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ کی بچیاں کئی کئی بچوں کی مائیں بھی ہیں۔ میں تو سارا دن کھیتوں پر کام کرتا رہتا ہوں۔ زرینہ میری بچی گھر پر تنہا رہتے رہتے تنہائی کا شکار ہوگئی ہے یا پھر مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اس پر جن کا سایہ ہوگیا ہے۔‘‘

’’آخر ایسا کیا ہوا جو آپ کو یہ شک گزرا۔‘‘ مولوی مشتاق علی نے پوچھا۔

’’مولوی صاحب! وہ پہلے تو اکیلے میں بیٹھی خود ہی کسی سے باتیں کرتی رہتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ اب اسے عجیب سے دورے پڑنے لگے ہیں۔ اس دورے کی کیفیت میں وہ بری طرح چیختی اور چلاتی ہے۔ اس کی آواز بھاری ہو جاتی ہے اور پھر قابو میں نہیں آتی۔

میں تو پہلے ہی اس کے رشتے کے لیے پریشان ہوں کہ کوئی رشتہ نہیں آتا اور اب اگر یہ بات سب لوگوں کو معلوم ہوئی کہ زرینہ پر کسی جن کا سایہ ہے تو پھر تو مجھے یہ بات ہمیشہ کے لیے بھول جانا چاہیے کہ اس کا رشتہ آئے گا اور اس کی شادی ہوگی۔‘‘ بختیار حسن نے اپنی بات ختم کر کے نہایت آس بھرے انداز میں ان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

’’اچھا تو یہ بات ہے۔ اب آپ یہ بتائیے اس سلسلے میں آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں، میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟‘‘ مولوی مشتاق علی نے کہا۔

’’مولوی صاحب! میں چاہتا ہوں کہ آپ میری بچی کا جن اتار دیں۔‘‘ بختیار حسین نے کہا۔

’’جن اتار دوں؟‘‘ مولوی مشتاق علی نے حیرانی سے کہا۔ ’’ارے بختیار صاحب مجھے جن وغیرہ اتارنے نہیں آتے اور نہ ہی میں نے کبھی یہ کام کیا ہے۔ آپ ایسا کریں اگر ایسی ہی بات ہے تو آپ انہیں ایسے کسی عامل کامل کے پاس لے جائیں جو جن بھوت کو قابو میں کرنا جانتا ہو۔‘‘

’’گاؤں میں ایک ایسے عامل صاحب ہیں تو سہی مگر ان کے آستانے پر تو ہر وقت لوگوں کا ہجوم لگا رہتا ہے اور اگر میں زرینہ کو وہاں لے کر گیا تو یہ جن والی بات چھپی نہیں رہے گی اور کل گاؤں کے بچے بچے کی زبان پر یہ جملہ ہوگا کہ زرینہ پر جنات کا سایہ ہے۔ مولوی صاحب میں آپ کے پاس بہت امید لے کر آیا ہوں۔ آپ اللہ کے نیک بندے ہیں۔ مسجد میں نماز پڑھاتے ہیں۔ آپ اللہ کا کلام پڑھ کر دم کریں گے تو زرینہ کا جن بھاگ جائے گا۔‘‘ بختیار حسین نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد مولوی مشتاق نے کہا۔ ’’اچھا آپ بعد نمازِ عصر بچی کو لے آیئے گا۔ میں اللہ کا کلام پڑھ کر دم کر دوں گا۔ امید ہے کہ پاک کلام کی برکت سے بچی کے جنون کو افاقہ ہوگا۔

اور پھر عصر کی نماز کے بعد بختیار حسین نے خاموش نگاہوں سے مولوی صاحب سے زرینہ کو ساتھ لانے کی اجازت مانگی اور مولوی صاحب نے سر کے ہلکے سے اشارے سے ہاں کہہ دیا۔ مسجد نمازیوں سے تقریباً خالی ہو چکی تھی۔ اکا دکا آدمی مسجد میں موجود تھے اور ذکر و اذکار میں مصروف تھے۔

تب ہی مولوی صاحب نے بختیار حسین کو دیکھا وہ ہاتھ کے اشارے سے مولوی صاحب کو بلا رہا تھا۔ مولوی صاحب آہستہ قدموں سے نہایت متانت کے ساتھ بختیار حسن کی جانب بڑھے۔ تب ہی انہوں نے پہلی مرتبہ زرینہ کو دیکھا۔ وہ بڑی سی سفید چادر میں اپنا آپ چھپائے سر جھکائے کھڑی تھی۔

مولوی صاحب خاموشی سے اپنے حجرے کی جانب بڑھ گئے۔ مسجد سے باہر ایک چھوٹا سا کمرہ اور اس کے آگے ایک معمولی سا صحن اور اس صحن میں ایک غسل خانہ اور چھوٹا سا باورچی خانہ بنا تھا۔ یہی حجرہ مولوی صاحب کا گھر تھا جہاں وہ تنہا رہتے تھے۔

مولوی صاحب نے دروازے کی کنڈی کھولی اور اندر داخل ہوگئے۔ ان کے پیچھے بختیار حسین اور زرینہ بھی داخل ہوگئے۔

صحن میں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ مولوی صاحب نے چارپائی کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ ’’بیٹھئے۔‘‘ اور دونوں باپ بیٹی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ جبکہ مولوی صاحب کھڑے رہے۔ زرینہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔

مولوی صاحب نے کھڑے کھڑے زیرِ لب قرآنی آیات پڑھنی شروع کی اور دور ہی سے اس کے اوپر پھونک ماردی۔ پھر صراحی سے کٹورے میں پانی ڈالا اور اس پر دم کر کے بختیار حسین کی جانب بڑھا کر کہا۔

’’بیٹی کو یہ پانی پلا دو۔‘‘ اور ساتھ ہی چاروں قل اور درود شریف پڑھنے کی بھی تاکید کی اور پھر دونوں باپ بیٹی وہاں سے چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد مولوی صاحب سوچنے لگے کہ اس لڑکی میں ایسی تو کوئی علامت دکھائی نہیں دے رہی تھی جیسا کہ بختیار حسین بیان کر رہے تھے۔ خیر ہوتا ہوگا ایسا کسی وقت انہوں نے فی الحال اس خیال کو جھٹک دیا۔

مگر اس وقت جب وہ سونے کے لیے لیٹے تو ایک بار پھر زرینہ کا چہرہ ان کی نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ کتنا ملیح اور شرم و حیا والا چہرہ تھا۔ حیرت ہے کسی کو آج تک اس کی خوب صورتی نہیں دکھائی دی۔

پھر جیسے وہ اچانک ہوش کی دنیا میں لوٹ آئے۔ زرینہ کے خیال کے بار بار آنے پر انہوں نے کئی مرتبہ لاحول ولاقوۃ پڑھی اور اس خیال کو جھٹک کر سونے کی کوشش کرنے لگے اور تھوڑی ہی دیر بعد مولوی مشتاق کے خراٹے حجرے کی چار دیواری سے ٹکرا رہے تھے۔

مولوی مشتاق کو عنایت نگر آئے ہوئے دو سال کا عرصہ ہی ہوا تھا۔ اس سے پہلے وہ شاداب آباد میں رہتے تھے۔ وہیں وہ پیدا بھی ہوئے، پلے بڑھے بھی۔ انہوں نے سوچا نہیں تھا کہ انہیں یوں دل برداشتہ ہو کر اپنا آبائی گاؤں چھوڑ کر جانا پڑے گا۔

انہیں وہ سب باتیں آج بھی یاد تھیں۔ اپنے بچپن کی جوانی کی اور وہ دن ......

وہ ان سب گزری باتوں کو بھلانا بھی چاہیں تو نہیں بھلا سکتے تھے۔ ان کا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں تھا۔ انہیں تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اب ان کے رشتہ داروں میں دور دور بھی کوئی زندہ ہے بھی یا نہیں۔

ان کی زندگی کی کہانی بھی بڑی عجیب تھی۔ انہیں یاد نہیں کہ ان کے بہن بھائی بھی تھے بھی یا نہیں اور اگر تھے تو کتنے؟

انہوں نے تو اپنے بارے میں یہ سنا تھا کہ وہ بہت چھوٹے تھے تب شاداب آباد میں زلزلہ نے شدید قسم کی تباہ کاریاں مچائیں' سینکڑوں مکانات اور ہزاروں لوگ منوں مٹی تلے دفن ہو گئے۔ اسی تباہ کن زلزلے کی زد میں ان کا خاندان بھی آ گیا۔ سب ہی ختم ہو گئے۔ اللہ کی قدرت سے صرف ایک وہی زندہ بچے اس وقت ان کی عمر صرف چار سال کی تو تھی۔

امدادی ٹیمیں زلزلہ زدگان کی امداد کے لیے تیزی سے پہنچ رہی تھیں۔ تیزی کے ساتھ ملبہ ہٹایا جا رہا تھا کہ شاید ان میں دب جانے والے لوگوں میں سے کسی ایک میں بھی سانس باقی ہو تو اسے بچا لیا جائے۔

اور پھر ایک مکان کے ملبے میں سے کسی بچے کے زور زور سے چیخ کر رونے کی آوازیں آئیں۔ امدادی ٹیموں کے ارکان نے آواز دے کر اور بھی دوسرے لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لیا تاکہ ملبہ ہٹانے کا کام تیزی سے کیا جا سکے۔

اور پھر امدادی کارکنوں کو مولوی مشتاق نظر آ گئے جو چوٹ لگنے سے بلک بلک کر رو رہے تھے۔ لوگوں نے اور بھی زندہ لوگوں کو تلاش کرنا چاہا مگر وہاں صرف لاشیں ہی ملیں۔

مولوی مشتاق کو ڈاکٹروں نے طبی امداد دی مگر وہ مسلسل رو رہے تھے۔ امی ابا کو پکار رہے تھے۔ ہر کوئی انہیں چپ کرانے کی اپنی سی کوشش کر کے تھک گیا تھا۔ انہوں نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا۔

تب ہی ایک بالشت بھر داڑھی والے ایک مولانا ان کے قریب آئے اور ان کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا تو انہوں نے چونک کر ان کی جانب دیکھا اور پھر چپ ہو گئے۔

سب ہی نے یہ قیاس آرائی کی کہ اس بچے کے کوئی رشتہ دار کی یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ والد یا دادا کی شکل ان سے ملتی ہو۔

اور پھر مولوی مشتاق نے ان کے ہاتھ سے کھانا اور دوا بھی کھائی اور سو گئے۔

یہ مولانا فتح اللہ تھے جنہوں نے مولوی مشتاق کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا تھا۔

اس تباہ کن زلزلے نے کتنوں کی اولادوں کو چھین لیا' کتنے ہی بچے یتیم ہو گئے۔ ان یتیم اور بے سہارا ہونے والے بچوں میں مولوی مشتاق بھی تھے جن کا اس بھری دنیا میں تنہا رہ جانے کے سبب مولانا فتح اللہ نے گود لے لیا اور اپنے گھر لے آئے۔

مولانا فتح اللہ کے گھر میں ان کی زوجہ کے علاوہ تیسرا کوئی فرد نہیں تھا۔ اللہ نے انہیں اولاد کی نعمت سے محروم ہی رکھا تھا۔ مولانا فتح اللہ کی زوجہ اتنے خوب صورت اور معصوم بچے کو کلیجے سے لگا کر اس کے دکھ پر بلک پڑیں۔ تب ہی مولانا فتح اللہ نے مسکراتے ہوئے ان سے کہا۔

’’سلطانہ بیگم! لو آج اللہ نے تمہاری دعا قبول کر لی۔ تمہیں بیٹھے بٹھائے اور ماں بننے کی کوئی تکلیف اٹھائے بغیر ایک بیٹے کی ماں بنا دیا۔ مشتاق میاں آج سے ہمارے بیٹے ہیں۔‘‘

اور یوں مولوی مشتاق کو اللہ تعالیٰ نے ان کے اپنے' اپنے پاس بلانے کے باوجود تنہا نہیں چھوڑ اور نیک لوگوں کی پناہ گاہ نصیب کر دی۔

وقت گزرتا رہا۔ مولوی مشتاق اپنے معصومیت کے دکھ کو بہت جلد بھول گئے اور وہ عظیم حادثہ بھی بہت جلد ان کی یادداشت سے محو ہو گیا۔ وہ انہیں ہی اپنا ماں باپ سمجھنے لگے۔ جب مولوی مشتاق سن شعور کو پہنچے تو مولانا فتح اللہ نے انہیں یہ بات بتا دی کہ وہ کس طرح حادثاتی طور پر ان کی زندگی میں آئے اور ان کی سونی زندگی کو خوب صورت رنگوں سے بھر دیا۔

ابھی مولوی مشتاق کی عمر سولہ برس ہی کی تھی کہ مولانا فتح اللہ اللہ کے گھر سدھار گئے تب ان کی اور گاؤں کے دوسرے لوگوں کی خواہش پر انہوں نے اس مسجد کی امامت کے فرائض مولانا فتح اللہ کی جگہ سنبھال لیے جس میں وہ امامت کرتے تھے۔

اور پھر دو سال کا عرصہ گزرنے کے بعد مولوی مشتاق کی منہ بولی ماں بھی ان کا ساتھ چھوڑ گئیں وہ ایک بار پھر تنہا رہ گئے۔

گھر میں کھانا پکانے یا دیگر گھریلو کاموں کے لیے اب ان کے پاس کوئی نہیں تھا۔ وہ جیسے تیسے بھی ہوتا خود ہی کرنے کی کوشش کرتے۔ اماں کی زندگی میں انہوں نے کبھی بھی باورچی خانے کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ اس لیے انہیں کھانا پکانا نہیں آتا۔ ہاں البتہ ہفتے میں ایک بار وہ گھر کی جھاڑو دے لیا کرتے اور اپنے کپڑے وغیرہ دھو لیا کرتے تھے۔

ایک دن وہ باورچی خانے میں کچھ پکانے کی کوشش کر رہے تھے تب ہی اقبال احمد ان کے گھر آ گئے۔ مولوی مشتاق کو جو یوں باورچی خانے میں پریشانی کے عالم میں دیکھا تو انہیں احساس ہوا کہ بے چارے مولوی صاحب ماں کے گزر جانے کے بعد کتنی بڑی پریشانی میں گھر گئے ہیں۔ یعنی جو کام ان کے کرنے کے نہیں ہیں وہ انہیں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

انہیں اپنے اوپر بے حد شرمندگی ہوئی۔ کیا ایسے شخص کے لیے جو ہماری نمازوں کے لیے امامت کے فرائض انجام دے رہا ہے کیا ہم اس کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ ان کی مدد کر دیں۔ یہی سوچ کر انہوں نے مولوی مشتاق سے کہا۔

’’ارے مولوی صاحب! آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟‘‘

’’کچھ نہیں بہت بھوک لگ رہی تھی۔ اس لیے کچھ پکانے کی ناکام کوشش کر رہا ہوں۔ جبکہ مجھے تو اس کام کی الف بے بھی نہیں آتی۔‘‘ مولوی مشتاق نے جھینپ کر کہا۔

مولوی صاحب کے چہرے پر شرمندگی کے آثار دیکھ کر اقبال احمد جلدی سے بولے۔

’’آپ شرمندہ کیوں ہو رہے ہیں بلکہ شرمندگی تو ہمیں ہونی چاہیے کہ ہم نے آپ کی ان پریشانیوں کے بارے میں بالکل بھی نہیں سوچا۔ حالانکہ میرے گھر میں بیوی ہے بیٹی ہے جو سارے گھر کا کام سنبھالتی ہیں۔ اب کل سے میری بیٹی حنا آپ کی غیر موجودگی میں سارے گھر کا کام کر لے گی۔ کھانا بھی گھر سے آ جایا کرے گا۔ اب آپ کو کسی بھی کام کو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔‘‘

’’ارے نہیں اقبال بھائی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آہستہ آہستہ سب کچھ کرنا آ ہی جائے گا۔ آپ کو آپ کے گھر والوں کو میرے لیے اتنی تکلیف اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔‘‘ مولوی مشتاق نے تیزی سے کہا۔

’’ارے بھئی آپ تو تکلف کر رہے ہیں۔ میری بیٹی بہت اچھی ہے اسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔‘‘ اور اقبال احمد نے بضد اصرار مولوی مشتاق سے اپنی منوا کر ہی چھوڑی۔

اور اس دن کے بعد سے مولوی صاحب جب پھر گھر آتے گھر اور باورچی خانہ صاف ستھرا ملتا۔ وہ جو بھی میلے کپڑے اتار کر جاتے واپسی پر وہ دھلے ہوتے الگنی پر ملتے۔ کھانا البتہ ان کے گھر آنے کے بعد گرم گرم آتا۔

کبھی اقبال صاحب خود کھانے کی ٹرے لے کر حاضر ہو جاتے کبھی ان کا چھوٹا لڑکا یا لڑکی کھانا لے کر آتا۔ مولوی مشتاق کبھی کبھی تنہائی میں ان ہاتھوں کے بارے میں سوچتے جو یہ سب کام انجام دیتے تھے مگر انہوں نے آج تک اس کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ کون ہے' کیسی ہے' انہیں بار بار خیال آتا مگر پھر جلد ہی وہ لاحول ولاقوۃ پڑھ کر اپنے دل میں آنے والے ان خیالوں کو جھٹک دیتے۔

اور پھر ایک دن وہ بھی ہو گیا جس کی خواہش ان کے دل کے کسی کونے میں چھپی ہوئی تھی۔ آخر وہ بھی انسان تھے اور وہ بھی جوان۔ اپنی فطری خواہشات سے بھٹک بھاگتے رہتے۔

انہیں پتہ چلا کہ اقبال احمد بہت سخت بیمار ہے۔ اس دن کھانا لے کر جب اقبال کا بیٹا گھر آیا تو اس نے بتایا۔

’’اچھا اپنے والد صاحب سے کہنا کہ میں وقت ملتے ہی ان کی مزاج پرسی کے لیے ضرور آؤں گا۔‘‘ مولوی مشتاق احمد نے کہا اور کھانے کے بعد ظہر کی نماز کے لیے مسجد چلے گئے۔ نماز کے بعد کچھ لوگوں سے بات چیت میں مصروف ہو کر وقتی طور پر وہ اس بات کو بھول گئے اور پھر بچے بھی مسجد میں قرآن پڑھنے آ گئے۔ پھر تو ان کے ذہن سے بالکل ہی یہ بات نکل گئی۔ ان کی واپسی مغرب کے بعد ہی ہوئی۔

رات کا کھانا مغرب کی نماز کے بعد آیا کرتا تھا مگر اس دن کھانا آنے میں دیر ہوگئی۔ تب اچانک انہیں خیال آیا کہ اقبال احمد بیمار ہیں۔ اللہ کرے سب خیریت ہو۔ میں تو یہ سب بالکل ہی بھول گیا۔ مجھے ان کے گھر جانا تھا۔ انہوں نے اپنے بھول جانے پر لاحول پڑھی اور اقبال احمد کے گھر جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔

تب ہی ہلکے سے دروازہ بجنے کی آواز آئی تو وہ دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھے۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا صرف بھڑا ہوا تھا۔

’’کون آ گیا؟‘‘ انہوں نے حیرانی سے سوچا اس لیے کہ جو بھی آتا تھا بے دھڑک اندر آ جاتا تھا۔ وہ سوچتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھے اور پٹ کھول کر دیکھا تو ان کے قدم جیسے زمین پر جم گئے۔

سامنے ایک چاند چہرہ سر جھکائے ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے لیے موجود تھا۔ سفید دوپٹے کے ہالے میں گھرا وہ چہرہ اتنا دل کش تھا کہ مولوی مشتاق ایک ٹک اسے دیکھے چلے گئے۔

’’یہ...... یہ ...... کھانا ہے مولوی صاحب! اتفاق سے منی اور چھوٹے کو بھی بخار آ گیا ہے۔ ابا کی طبیعت تو پہلے ہی خراب تھی۔ اس لیے آج دیر ہوگئی۔‘‘ اس نے ہلکی آواز میں معذرت کرتے ہوئے کہا اور ٹرے آگے بڑھا دی۔ تب جیسے مولوی مشتاق ایک دم ہوش میں آ گئے اور بولے۔

’’میں بس آپ ہی کی طرف آ رہا تھا۔‘‘ یہ کہتے ہوئے انہوں نے ٹرے تھام لی۔ ٹرے مولوی مشتاق کے ہاتھوں میں تھما کر وہ چھپاک جیسی غائب ہو گئی اور مولوی مشتاق دوپٹے کے نیچے تک آتی ہوئی اس کی دراز چوٹی دیکھتے رہ گئے۔

وہ ایک گہری سانس لے کر ٹرے لے کر اندر آ گئے۔ آج ان سے کھانا نہیں کھایا گیا۔ وہ مسلسل اس کے بارے میں سوچ رہے تھے یکا یک انہیں اپنی سوچوں پر شدید شرمندگی کا احساس ہوا اور انہوں نے فوراً توبہ کی اور کھانا کھا کر اقبال کی مزاج پرسی کے لیے ان کے گھر چلے گئے۔

اور پھر تین دن ان کے لیے کھانا وہی لاتی رہی۔ بنا کچھ کہے وہ ٹرے ان کے ہاتھوں میں دیتی اور تیزی سے لوٹ جاتی۔ پھر چھوٹے کی طبیعت ٹھیک ہوگئی تو اس کا آنا بند ہو گیا۔

مولوی مشتاق اس دن سے مسلسل اس کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہے تھے۔ بار بار اپنے خیالوں کو جھٹکتے' مگر جتنا وہ اس کے خیالوں سے پیچھا چھڑانا چاہتے اس کا خیال اتنی شدت سے ابھرتا۔ تب انہوں نے فیصلہ کیا کہ انہیں شادی کر لینی چاہیے۔

وہ عمر کے اس حصے میں ہیں جب ایک ساتھی کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے اور مسلمان کو جلد نکاح کرنے کا حکم اسی لیے ہے کہ وہ پاکیزہ رہے اور اس کے کسی گناہ میں پڑنے کا اندیشہ نہ رہے۔ انہیں یاد آیا کہ ایک مسلمان مرد یا عورت کا کسی نامحرم کو دیکھنا یا اس کے بارے میں سوچنا بھی زنا کے زمرے میں آتا ہے

مگر میں یہ بات اقبال بھائی سے کیسے کہوں کہ میں ان کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کاش کہ آج اماں ابا زندہ ہوتے تو وہ میری اس تنہائی کا خیال کرتے اور خود ہی بات کرتے۔ ان کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنے بارے میں یہ بات کریں۔

حالانکہ ان کے کہنے پر انہوں نے کتنے ہی لوگوں کے رشتے کی بات کی۔ کتنے ہی نکاح پڑھائے مگر آج جب ان کا وقت آیا تو انہیں یہ کام کتنا مشکل لگ رہا ہے۔ وہ سوچتے رہے اور ایک دن اقبال احمد نے خود ہی یہ بات چھیڑ دی اور بولے۔

’’مولوی صاحب! اب آپ بھی شادی کر کے گھر بسا لیں ......‘‘

مولوی مشتاق نے اقبال احمد کے منہ سے یہ بات سنی تو ان کا دل بلیوں اچھلنے لگا اور انہیں لگا کہ وہ اب شاید خود ہی اپنی بیٹی کے رشتے کی بات کریں گے یا شاید وہ ایسا چاہتے ہیں مگر انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی اور بات وہیں ختم ہوگئی۔

اقبال احمد سے ہر ملاقات پر مولوی مشتاق کو یہ آس ہوتی کہ ان کی شادی کی بات وہ پھر سے چھیڑیں گے مگر وہ تو شاید اس بات کو بالکل ہی بھول گئے تھے۔

آخر ایک دن انہیں خیال آیا کہ انہیں یہ بات کسی اور کے ذریعے اقبال احمد تک پہنچانی چاہیے۔ اقبال احمد کی طرح وصی صاحب سے بھی ان کے اچھے تعلقات تھے۔ اسی لیے انہوں نے ان سے ہی بات کرنے کا سوچا۔

’’وصی بھائی! آج رات عشاء کی نماز کے بعد آپ میرے گھر آ جایئے گا۔ مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔‘‘ مولوی مشتاق نے نگاہیں نیچی کر کے کہا۔

’’ہاں ہاں ضرور مولوی صاحب! مگر کیا کوئی خاص بات ہے؟‘‘ انہوں نے مولوی مشتاق کے چہرے پر جھلکتی ہوئی حیا کی ہلکی سی لالی کو محسوس کرتے ہوئے مشکوک انداز میں پوچھا۔

’’جی ہاں۔ خاص ہی ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے میں حاضر ہو جاؤں گا۔‘‘ وصی صاحب نے کہا۔

tsurdu.blogspot.com

tsurdu.blogspot.com

اور رات کو عشا کی نماز کے بعد وصی صاحب مولوی مشتاق کے ہمراہ ان کے گھر چلے آئے۔ راستے میں ان دونوں میں اس خاص بات کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ گھر آ کر اطمینان سے بیٹھنے کے بعد بھی مولوی مشتاق کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اپنا مدعا بیان کرتے۔ ایک جھجک ان کے آڑے آ رہی تھی۔ تب وصی صاحب خود ہی پوچھ بیٹھے۔

''ہاں مولوی صاحب! اب بیان فرمایئے آپ نے مجھے کوئی بات کرنے کے لیے بلایا تھا۔''

''جی ہاں۔ وہ دراصل ......'' مولوی مشتاق اتنی بات کر کے خاموش ہو گئے۔

''ہاں ہاں کہیےناں۔ آپ چپ کیوں ہو گئے؟'' وصی صاحب نے اپنا تجسس ظاہر کیے بغیر بظاہر اطمینان سے کہا۔

''سمجھ میں نہیں آ رہا کیسے کہوں۔ دراصل بات یہ ہے کہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ ہماری اماں کے گزر جانے کے بعد ہمیں بے حد پریشانی رہنے لگی ہے۔ گھر کے انتظام کو سنبھالنے والا کوئی بھی نہیں ہے۔ ہماری وجہ سے اقبال بھائی کے گھر والوں کو بہت پریشانی اٹھانی پڑتی ہے اس لیے ہم نے سوچا ہے کہ ہم شادی کر لیں۔'' مولوی مشتاق نے جھجکتے ہوئے بمشکل کہتے ہوئے اپنی پیشانی سے ڈھیر سارا پسینہ صاف کیا۔

''بہت ہی نیک خیال ہے۔ میں آج ہی گھر میں جا کر اس موضوع پر بات کروں گا۔ وہی کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر آپ کے لیے رشتے کے لیے بات چلائیں گی۔'' وصی صاحب نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ وصی بھائی۔'' مولوی مشتاق نے نیازمندی سے کہا مگر ہماری ایک گزارش ہے اگر آپ مانیں تو ......''

''ہاں فرمایئے۔'' وصی بھائی بولے۔

''ہم چاہتے ہیں کہ آپ خود اقبال بھائی سے بات کریں کہ ہم ان کی بڑی بیٹی سے رشتے کے خواہش مند ہیں۔'' مولوی مشتاق نے کہا۔

''جی۔'' وصی بھائی نے حیرت سے کہا۔

''کیوں کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی۔ ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ آپ اپنی گھر والی سے کہیں گے کہ کوئی اچھی سی لڑکی ..... تو ہم نے سوچا کہ ان کی مشکل ہم یوں حل کیے دیتے ہیں اچھی سی لڑکی بتائے دیتے ہیں۔'' مولوی مشتاق نے دھیمی اور شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ نیچی نگاہ کر کے کہا۔

مگر جواب میں وصی بھائی مولوی مشتاق کو عجیب نگاہوں سے دیکھتے رہے اور یہ کہتے ہوئے اٹھ گئے۔

''ٹھیک ہے میں اقبال بھائی سے بات کر کے آپ کو جواب دے دوں گا۔'' مگر ان کے لہجے میں چھپے غصے کو مولوی مشتاق محسوس نہ کر سکے۔

''میں چاہتا ہوں کہ آپ جلد ہی ان سے بات کر لیں میں سب کچھ بہت سادگی سے کرنا چاہتا ہوں اور میں انہیں کسی بھی قسم کا زیر بار نہیں کرنا چاہتا۔ اللہ کا فضل ہے کہ گھر میں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔'' مولوی مشتاق نے چلتے ہوئے کہا۔

''جی۔'' وصی بھائی نے ہونٹ بھینچتے ہوئے اتنا کہا اور گھر سے نکل گئے اور جاتے ہوئے ان سے مصافحہ بھی نہیں کیا۔

وصی بھائی مولوی مشتاق کے ہاں سے نکل کر سیدھے اقبال بھائی کے دروازے پر پہنچے اور بے تابی سے دروازہ پیٹ ڈالا۔

دروازہ اقبال بھائی نے ہی کھولا۔ وصی بھائی کو دروازے پر کھڑے دیکھا تو خوش دلی سے زوردار سلام کیا۔

''اقبال بھائی اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔ مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔'' وصی بھائی نے ان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں اندر آیئے۔ کیا بات ہے؟ سب خیریت تو ہے نا؟'' اقبال بھائی نے ہلکی سی پریشانی سے کہا۔

''اندر چل کر بتاتا ہوں۔'' وصی بھائی نے دروازے کے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں اب اطمینان سے بتایئے کہ کیا بات ہے؟ آپ مجھے کچھ گھبرائے ہوئے اور پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔'' اقبال بھائی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''توبہ توبہ کیا زمانہ آ گیا ہے۔ اب تو کسی کا بھی اعتبار نہیں رہا۔ لو بتاؤ اب مولوی مشتاق جیسے لوگ بھی ایسی باتیں کرنے لگے۔ باقی سب کا تو اللہ ہی مالک ہے۔'' وصی بھائی نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''اللہ خیر کرے ایسا کیا کر دیا مولوی مشتاق نے؟'' اقبال بھائی نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

''کہنا کیا ہے آپ کو تو معلوم ہی نہیں کہ یہ موصوف تو آپ کے گھر پر ہی آنکھ لگا بیٹھے ہیں۔'' وصی بھائی نے بات کو نہایت غلط رنگ دیتے ہوئے غلط انداز میں بیان کیا۔

''کیا مطلب؟'' اقبال بھائی الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

''مطلب یہ کہ موصوف نے اپنی بیٹی رضیہ سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔'' پھر انہوں نے پوری بات کو مزید غلط انداز میں پیش کیا۔ ان کی ان ساری باتوں سے یہ مطلب اخذ کیا گیا کہ وہ رضیہ سے عشق کرتے ہیں اور اس کے علاوہ کہیں اور شادی نہیں کریں گے۔

وصی بھائی کی بات سن کر اقبال بھائی کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو گیا اور وہ کانپتے ہوئے بولے۔

''میں مولوی مشتاق کے بارے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ میری بیٹی کے بارے میں ایسی بات کریں گے۔ میں ابھی ان کے پاس جاتا ہوں۔'' انہوں نے غصے میں کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''ارے اقبال بھائی! بات تو سنیں۔'' وصی بھائی ان کا ہاتھ پکڑتے رہ گئے مگر انہوں نے ان کی ایک بات بھی نہیں سنی اور غصے سے مولوی مشتاق کے دروازے میں گھستے چلے گئے۔

مولوی مشتاق ابھی تک اسی حالت میں بیٹھے تھے جس میں وصی بھائی انہیں چھوڑ کر گئے تھے۔ اقبال بھائی کو یوں اچانک سامنے دیکھا تو ایک دم کھڑے ہو گئے۔

''ارے اقبال بھائی آپ!''

''یہ میں کیا سن رہا ہوں مولوی صاحب ابھی آپ نے وصی بھائی سے کیا کہا ہے؟'' اقبال بھائی نے شدت غصے سے پوچھا۔

اقبال بھائی کو یوں غصے میں دیکھا تو مولوی مشتاق بری طرح گھبرا گئے اور بولے۔

''ہاں ابھی میں نے ...... وصی بھائی سے ایک بات کہی تھی۔ کک ...... کیا آپ کو وہ بات بری لگی ہے؟''

''بری! ارے برا کہنا تو بہت چھوٹا لفظ ہے۔ میرے تو تن بدن میں آگ لگ گئی ہے۔'' ''آپ نے ایسا سوچا بھی تو کیسے ......؟ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ کیا آپ ہی میری بیٹی کے لیے رہ گئے ہیں اور میں آسانی سے اس کا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دے دوں گا۔ ایک ایسے آدمی میں جو صدقہ خیرات کا کھانا کھاتا ہو مردوں کے ایصال ثواب میں دیئے گئے لباس پہنتا ہو مردے نہلاتا ہو جنازے پڑھاتا ہو میری بچی کو ہر وقت آپ کے پاس سے مُردوں کی ہی خوشبو آئے گی۔ آپ اپنے لیے اپنے ہی جیسے کسی مولوی کی لڑکی کو دیکھئے جو ان سب باتوں کی عادی ہو۔ اسے تو کافور کی خوشبو بھی عطر کی لگے گی۔

میں نے تو آپ کو ایک بہت شریف آدمی سمجھا تھا۔ آپ کا اتنا خیال رکھا اپنے گھر سے پکا پکایا کھانا کھلایا اور آپ نے میری ہی گھر میں آنکھ رکھ دی۔ استغفر اللہ ...... استغفر اللہ ...... آئندہ اگر آپ نے ایسا سوچا بھی یا کسی اور سے اس بات کا ذکر کیا تو اچھا نہیں ہوگا۔ آپ میری بیٹی کو بدنام کریں گے۔ بتاؤ دنیا کیا کہے گی۔ ایک مولوی کے یہ کرتوت ......'' اقبال بھائی نجانے اور کیا کیا باتیں انہیں سنا رہے تھے اور ان کی انتہائی تکلیف دہ باتیں سن سن کر مولوی مشتاق کا یہ حال تھا کہ وہ پسینے میں سرتاپاؤں ڈوبے کھڑے لرز رہے تھے۔ ان کی زبان میں اتنی بھی سکت بھی نہیں تھی کہ وہ صرف اتنا کہہ سکیں۔

''اقبال بھائی آپ نے غلط سمجھا ہے۔ بخدا ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں بھی تو خدا کا خوف رکھتا ہوں۔ اتنی رذیل سوچ میری نہیں ہو سکتی۔'' اور وہ کچھ بھی نہ کہہ سکے اور اقبال بھائی اپنا کام کر کے چلتے بنے۔

ان کے جانے کے بعد مولوی مشتاق اپنے لرزتے قدموں کو سنبھالتے مصلیٰ بچھا کر اللہ کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی زبان پر تلاوت جاری تھی اور آنکھوں سے اشک رواں تھے۔

وہ سجدے میں سر رکھ کر دیر تک گریہ زاری کرتے رہے۔

بار بار اللہ کے آگے گڑگڑا کر توبہ کرتے رہے کہ میرے مالک میری ایک اتنی سی خواہش کی تو نے مجھے دنیا ہی میں بہت بڑی سزا دے دی ہے۔ آخرت میں مجھے اس کا عذاب نہ دینا۔

پھر انہوں نے اللہ سے پوچھا۔

''یا اللہ میں نے تو ایک نیک اور باحیا جیون ساتھی کی خواہش کی تھی کیا ہم جیسوں کو شادی کرنے کا حق نہیں ہے؟ کیا ہم اس قابل نہیں ہیں کہ وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ ہمارے ہاتھ میں دیتے تو پھر ہمارے پیچھے نماز کیوں پڑھتے ہیں؟ ہم سے مُردے کیوں نہلواتے ہیں؟ اپنے جنازے کیوں پڑھواتے ہیں؟ اگر اللہ صدقہ وخیرات کھلا کر اور ادا کر کے یہ اس کو حقیر سمجھتے ہیں تو کیا ان کا یہ عمل قبول کرے گا ......؟''

وہ رات ان کی زندگی کی انتہائی تکلیف دہ رات تھی۔ وہ پل بھر کے لیے بھی نہیں سو سکے۔ بس اپنے بارے میں اور لوگوں کے بارے میں سوچتے رہے۔

انہوں نے انتہائی دکھ سے سوچا۔

''آخر مولوی بھی تو گوشت پوست کا جسم رکھتے ہیں۔ ان کے سینے میں بھی ایک دل دھڑکتا ہے۔ اس میں بھی جذبات و احساسات ہوتے ہیں۔ میری ایک چھوٹی سی معصوم سی خواہش کیوں میرا جرم بنا دی گئی۔ کیوں مجھے اس بات کا احساس دلایا گیا کہ مولوی کا کام تو صرف ان کے کام آنا ہے۔ باقی کچھ نہیں۔''

صبح ان کا سارا جسم بخار میں تپ رہا تھا اور انہیں کچھ بھی ہوش نہیں تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ ان کی فجر کی نماز قضا ہوئی جہاں تک انہیں یاد پڑتا ہے۔ ابا فجر میں بھی ان کا ہاتھ تھام کر انہیں اپنے ساتھ مسجد میں لے جایا کرتے تھے۔

ایک ہفتے کی بیماری کے بعد جب وہ ٹھیک ہوئے تو انہوں نے چپ چاپ خاموشی سے کسی سے کچھ بھی نہیں کہا بس اپنے دو جوڑے کپڑے ایک تھیلے میں ڈالے اور جو تھوڑی بہت رقم پاس تھی وہ جیب میں رکھی اور گھر کو تالا لگائے بغیر دروازے کو بھیڑ کر انجانی راہوں کی جانب چل دیے۔

وہ پیدل چلتے جا رہے تھے۔ انہیں کچھ نہیں پتہ تھا کہ انہیں کہاں جانا ہے۔ بس وہ چلے جا رہے تھے چلتے چلتے وہ گاؤں سے باہر آ گئے۔ ذرا فاصلے پر ایک دوسرا گاؤں آباد تھا وہ یہاں بھی چلتے رہے۔

چلتے چلتے نجانے کتنا وقت بیت گیا' کتنا فاصلے طے ہو گیا وہ اس بات سے بے خبر تھے حد یہ کہ ان کی ٹانگوں نے مزید چلنے سے انکار کر دیا۔ حلق پیاس کی شدت سے چٹخنے لگا اور شدید کمزوری اور نقاہت نے آن گھیرا وہ ایک درخت کے موٹے تنے سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند کر بیٹھ گئے۔

تب ہی گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سن کر انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ سامنے سے ایک تانگہ آ رہا تھا۔ تانگے والا تنہا اپنا تانگہ لے کر جا رہا تھا۔ مولوی مشتاق کو دیکھا تو اس نے اپنا تانگہ روک دیا اور انہیں آواز دے کر پوچھا۔

''باؤ جی! کدھر کو جانا ہے۔ اگر جانا ہے تو آ جاؤ تانگہ خالی ہے۔''

مولوی صاحب چپ چاپ اٹھ کر تانگے میں جا کر بیٹھ گئے۔

''کدھر جانا ہے باؤ جی؟'' تانگے والے نے تانگہ چلاتے ہوئے پوچھا۔

''جہاں دل چاہے لے چلو میاں تانگے والے۔'' مولوی مشتاق نے گہری اداسی سے کہا۔

''کی مطلب؟'' تانگے والے نے حیرانی سے پوچھا۔

''تم کہاں جا رہے ہو؟'' مولوی مشتاق نے الٹا سوال کرتے ہوئے پوچھا۔

''میں تو جی ادھر ایک سواری لے کر آیا تھا۔ یہاں سے اگلے دو گاؤں چھوڑ کر میرا گاؤں ہے جی۔ اب سواری کو چھوڑا ہے تو اپنے گاؤں جا رہا ہوں۔''

''اچھا تو پھر ٹھیک ہے۔ میں بھی تمہارے گاؤں چلتا ہوں۔'' مولوی مشتاق نے کہا۔

''اچھا جی!'' تانگے والے نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ آخر اس سے رہا نہ گیا اور وہ پوچھ ہی بیٹھا۔

''او باؤ جی! آخر آپ کو پتہ کیوں نہیں تھا کہ آپ کو کدھر جانا ہے۔ او جی ہمارے گاؤں میں رات کو کہاں رکو گے؟ کوئی ہے تمہارا جاننے والا؟''

''پہلے تو کوئی نہیں تھا مگر اب ہے ناں۔'' مولوی مشتاق نے دھیمی سی مسکراہٹ سے کہا۔

''او جی! کون ہے وہ تم نام تو بتاؤ میں ادھر سب ہی کو جانتا ہوں۔''

''تم! تمہارے گاؤں میں اب میں تم سے تو واقف ہو گیا ہوں کہ تم تانگے والے ہو۔ ویسے کیا نام ہے تمہارا؟''

''وہ جی! رجو کہویں ہیں مجھے۔'' تانگے والے نے خوش ہو کر کہا۔

''اچھا رجو تم مجھے مسجد کے پاس اتار دینا۔'' مولوی مشتاق نے کہا۔

''اچھا اب میں سمجھا آپ مولوی جی کے پُرسے کو جا رہے ہو۔ بے چارے اللہ کو پیارے ہو گئے آج کوئی چوتھا روز ہو گیا۔'' تانگے والے نے مولوی مشتاق کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

جواب میں مولوی صاحب خاموش رہے۔ ان کے پاس اب ایک بہانہ آ گیا تھا اور کیا ہی اچھا ہو کہ انہیں مسجد میں امامت کے فرائض فرائض مل جائیں۔

اور یوں مولوی مشتاق جب سے یہاں کی مسجد میں امامت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ یہاں مسجد سے متصل انہیں ایک چھوٹا سا گھر ملا ہوا تھا۔ وہ یہاں تنہا رہتے تھے۔ اپنا ہر کام خود کرتے تھے۔ یہاں کے لوگوں نے بہت اصرار کیا کہ آپ کے کھانے کا انتظام ہمارے گھر سے ہو جائے گا مگر انہوں نے سختی سے منع کر دیا۔ وہ کسی کے گھر کا کھانا کھاتے تھے اور نہ ہی کسی سے کوئی لباس لیتے تھے۔

انہیں اپنی زندگی میں بہت تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ شادی کی خواہش کو بھی انہوں نے اپنے دل سے جڑ سے نکال پھینکا تھا۔

یہاں دو سال بیت گئے تھے۔ زندگی ایک ہی ڈگر پر رواں دواں تھی جب اس ٹھہرے ہوئے پانی میں زرینہ نام کا پتھر آن گرا۔

آج ایک بار پھر وہ خواہش شدت سے ابھر آئی مگر انہوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ تب ہی ایک دن بختیار حسین نے مولوی مشتاق سے بڑے جھجکتے ہوئے کہا۔

مولوی صاحب میں آپ سے بہت ضروری بات کرنے آیا ہوں۔ اگر آپ کو میری بات ناگوار گزرے تو اس بات کو یہیں اس طرح بھلا دیجیے گا جیسے کہ یہ کبھی ہوئی نہیں تھی۔

''نہیں نہیں بختیار بھائی! آپ کہیں بات چاہے جیسی بھی ہو میرا وعدہ ہے میں برا نہیں مانوں گا۔'' مولوی مشتاق نے خلوص سے بختیار حسین کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''سمجھ میں نہیں آ رہا کیسے کہوں؟'' بختیار بھائی جھجک کر رک گئے مگر مولوی صاحب نے انہیں ٹوکا نہیں اور ان کے بولنے کا انتظار کرنے لگے مگر ان کے اتنا زیادہ جھجکنے کی وجہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اس لیے وہ تھوڑی سی الجھن محسوس کرنے لگے۔

ذرا دیر بعد بختیار بھائی نے ہمت کی اور بولے۔

''مولوی صاحب! اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت پیاری بیٹی دی ہے۔ نیک ہے باحیا ہے' گھرداری میں مشتاق ہے۔ اللہ نے شکل وصورت بھی بھلی دی ہے مگر نصیب ...... میری بچی کا نصیب اللہ نے اچھا نہیں دیا وہ آج بھی میرے گھر بیٹھی ہے۔ میں بوڑھا ہو گیا ہوں بار بار یہ خیال آتا ہے کہ میری بچی کا میرے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ کل کو میری آنکھیں بند ہو جائیں گی تو اس کا کیا ہوگا؟'' اور یہ کہہ کر بختیار بھائی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

وہ اس مرتبہ بری طرح بلک بلک کر رو رہے تھے کہ مولوی مشتاق پریشان ہو گئے ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ آخر ان کی پشت پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''بھائی مجھے بتایئے میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟ میرے اختیار میں تو صرف یہ ہے کہ میں اللہ سے آپ کے اور آپ کی بیٹی کے لیے دعا کروں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی یہ پریشانی دور کرے اور جلد از جلد اس کے لیے کوئی اچھا سا رشتہ بھیج دے۔''

مولوی صاحب کی بات سن کر بختیار بھائی نے سر اٹھایا تو ان کا سارا چہرہ آنسوؤں سے بھرا ہوا تھا۔ انہوں نے بے تابی سے مولوی صاحب کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے پھر انہیں چوم کر چھوڑ دیا اور اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے بولے۔

''مولوی صاحب! میری ایک التجا ہے آپ مانیں گے؟''

''ارے یہ کیا کر رہے ہیں؟'' مولوی صاحب نے گھبرا کر بختیار بھائی کے بندھے ہوئے ہاتھ تھام کر کھول دیئے اور کہا۔ ''میں نے کہا ناں میں اللہ سے خصوصی دعا کروں گا۔ آپ پریشان مت ہوں اللہ تعالیٰ سب کچھ اچھا کر دے گا۔''

''دعائیں تو میں نے بہت کیں ہیں مولوی صاحب۔ آپ سے ایک التجا ہے۔'' بختیار بھائی ایک بار پھر رو پڑے۔

اس مرتبہ مولوی صاحب بری طرح الجھن کا شکار ہو گئے۔ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا آخر بختیار بھائی ان سے کیا چاہ رہے ہیں؟ کیا وہ یہ چاہتے ہیں کہ میں گاؤں میں نکل جاؤں اور ایک ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کر زرینہ کے لیے رشتہ ڈھونڈ لاؤں؟

مگر بختیار بھائی نے جو کچھ کہا اسے سن کر مولوی صاحب سناٹے میں آ گئے اور ان کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل سکا۔ بختیار بھائی نے کہا۔

''مولوی صاحب! آپ بھی تنہا ہیں اور میری زرینہ بھی۔ آپ زرینہ سے نکاح کر لیں۔''

''آپ کو پتہ ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' مولوی صاحب نے ٹھہری آواز میں کہا۔

''اچھا اچھا مولوی صاحب! مجھے معاف کر دیں۔ بس آپ اس بات کو یہیں بھول جائیں۔'' بختیار بھائی نے اپنے طور پر یہ سمجھ لیا کہ شائد مولوی صاحب کو ان کی بات بہت ہی ناگوار گزری ہے اس لیے وہ معافی مانگنے لگے۔

''نہیں بختیار بھائی! مجھے آپ کی بات قطعی بری نہیں لگی مگر کیا آپ نے بہت سوچ سمجھ کر یہ بات کی ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میرے پاس کوئی دولت پیسہ نہیں ہے۔ اپنا گھر بھی نہیں ہے' مسجد کے حجرے میں رہتا ہوں مُردے بھی نہلاتا ہوں اور جنازے بھی پڑھاتا ہوں۔ تو کیا آپ کی بیٹی کو میرے پاس سے کافور کی اور مُردوں کی خوشبو نہیں آئے گی۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہیں مولوی صاحب! ایک باپ اپنی بیٹی کے لیے جیسا نیک اور شریف لڑکا دیکھنا چاہتا ہے۔ آپ کے پاس وہ سب خوبیاں ہیں اور آپ نے میری بیٹی زرینہ کو دیکھا بھی ہے۔ اس دن میں آپ کے پاس دم کروانے کے لیے لایا تھا۔

''ٹھیک ہے بختیار بھائی! اگر آپ کی یہی خواہش ہے اور آپ خوب سوچ سمجھ کر یہ بات کہہ رہے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' مولوی مشتاق نے آہستہ سے کہا۔ پھر بولے۔ ''میرا تو خیال ہے کہ آپ ایک مرتبہ اور غور وخوص کر لیں۔''

''بہت بہت شکریہ مولوی صاحب! میں بہت غور وخوص کرنے کے بعد آپ کے پاس بات کرنے کے لیے آیا ہوں۔'' ''آپ نے ایک باپ کا مان رکھ لیا۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔''

اور یوں مولوی مشتاق کی زرینہ کے ساتھ شادی ہو گئی۔ آج ان کے دو چھوٹے چھوٹے بیٹے ہیں۔ دونوں بہت خوش وخرم زندگی گزار رہے

اور ہاں بختیار بھائی نے مولوی مشتاق کو آج تک یہ بات نہیں بتائی کہ ان کی بیٹی زرینہ کو کبھی کوئی دورہ نہیں پڑا وہ بالکل ٹھیک ٹھاک لڑکی تھی۔ وہ تو اپنی پیاری اور اکلوتی بیٹی کے لیے مولوی مشتاق جیسا لڑکا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے زرینہ کو ایک نظر دکھانا چاہتے تھے۔

اور مولوی مشتاق نے بھی زرینہ سے آج تک یہ بات نہیں پوچھی کہ تمہیں کس قسم کے دورے پڑتے تھے یا شادی کے بعد کبھی بھی کوئی دورہ کیوں نہیں پڑا شائد وہ بختیار بھائی کی چال کو سمجھ چکے تھے۔

tsurdu.blogspot.com